سائنس اور سماج
مکالمہ ضروری ہے
سعید ابراہیم

سیکس اور سماج

مکالمہ ضروری ہے

سعید ابراہیم

نروان پبلیکیشن ہاؤس

779-2 ڈی-1 نیو ٹاؤن شپ، لاہور، پاکستان

موبائل: 0321-4272847

Scanned by CamScanner

جنسی شناخت کا ایک اور پہلو 217

ہم جنس پسندی اور اس کا المیہ 217

مختلف جنسی شناخت ایب نارمل کیوں؟ 218

خواجہ سرا 225

جنسی بے راہ روی میں سماجی جبر کا حصہ 226

مذہبی مدارس اور ملت المشائخ 228

ہماری قابل احترام مگر ہم جنس پسند شخصیات 228

جنسی شناخت کا ایک اہم پہلو

ہم جنس پسندی اور اس کا المیہ

ہماری بندھی ہوئی نفسیات کا المیہ ہے کہ وہ ہمیں روٹین سے ہٹ کر سوچنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ہم سٹیریو ٹائپس کے کھونٹے سے بندھے ہیں اور انہیں دنیا کا سب سے بڑا سچ اور نارمل مظہر سمجھے بیٹھے ہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم صرف اپنی اور اپنے جیسے دوسروں کی فطرت کو ہی نارمل کا درجہ دیتے ہیں۔ اور اگر کسی کی فطرت ہم سے مختلف ہو تو ہم اسے نیچرل اور نارمل ماننے سے نہ صرف انکار کر دیتے ہیں بلکہ ایسے افراد کو اپنی فطرت کے اظہار کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ جب ہم ان معاملات کو اپنی محدود اور ناقص مذہبی آنکھ سے دیکھتے ہیں تو ہماری سوچ میں سختی اور تشدد کا عنصر بھی در آتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب ہم دلیل سے محروم ہو کر تجزیے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔

دنیا کا کوئی بھی معاشرہ ایسا نہیں جہاں ہوموسیکسوئل (مرد) لزبئین (عورتیں) اور تیسری جنس کے حامل خواجہ سرا نہ پائے جاتے ہوں۔ سوائے جنسیت کے اختلاف کے ان گروہوں سے وابستہ افراد بالکل ویسے ہی اچھے یا برے، اعلیٰ وادنیٰ، تخلیقی یا غیر تخلیقی ہوتے ہیں جیسے کہ ہم، جو اپنی جنسیت کی وجہ سے خود کو امتیازی طور پر 'نارمل' کا درجہ دیے بیٹھے ہیں اور محض اپنی اکثریت کی دھونس سے انہیں خوفزدہ کیے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ جو ہم اپنی جنسی شناخت کے نارمل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس میں ہمارا

کیا کمال ہے؟ یہ تو سراسر ایک فطری معاملہ ہے جس میں ہماری کسی خواہش یا فیصلے کا ذرا بھی عمل دخل نہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم سے مختلف جنسی شناخت رکھنے والے لوگ فطرت کی تخلیق نہیں ہیں؟ آپ کا کیا خیال ہے کہ ان گروہوں سے وابستہ افراد نے قدرت سے بغاوت کرتے ہوئے خود اپنی سیکسوئیلٹی کو ہم سے مختلف شکل میں ڈھال لیا ہے اور اب ہمارا یہ فرض ہے کہ ان کو اس بغاوت کی سزا دی جائے۔ اگر ہماری سوچ یہی ہے تو یقین جانئے ہم سخت غلطی پر ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس مسئلے کا تعصب کی عینک اتار کر جائزہ لیا جائے؟

پہلی بات تو یہ عام جنسی شناخت سے ہٹی ہوئی شناخت کے حامل افراد جو مرد اور عورت کے معمول کے رشتے سے ہٹ کر اپنی جنسی تشفی پر خود کو مجبور پاتے ہیں، وہ خود سے ایسے نہیں بنتے بلکہ یہ وصف ان کی فطرت میں موجود ہوتا ہے۔ خواجہ سرا بنتے نہیں بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کچھ افراد کے حوالے سے یہ معاملہ مختلف ہو اور وہ سماجی وجوہات کی بنا پر خواجہ سرا بننے کی جانب مائل ہو جاتے ہوں۔ اگر ایسا ہے بھی تو ہم پھر بھی اس بات پر اصرار کریں گے کہ سماجی اثرات چاہے کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں، فرد کی سرشت میں ایسا بننے کا رجحان لازماً موجود ہوتا ہوگا۔ ہاں البتہ سماجی رویے اس رجحان کو انگیخت کر کے واضح شکل دینے کا کام ضرور کرتے ہیں۔ فرض کیجئے اگر یہ انگیخت موجود نہ بھی ہو تو ہم ایسے فرد کی مختلف جنسی شناخت سے کیونکر انکار کر سکتے ہیں۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس صورت میں بھی وہ فرد مسلسل ایک خاص طرح کی بے چینی، کرب اور ذہنی تناؤ کا شکار رہتا ہوگا۔ میں ایسے کئی افراد کو جانتا ہوں جو ادھیڑ عمری تک گناہ کے تصور کے تحت اپنی جنسیت سے انکار کے عذاب میں مبتلا رہے۔ یہ نام نہاد نارمل جنسیت کے حامل افراد کے سماج کی ظالمانہ بے حسی ہے جو انسان کو انسان سمجھنے سے عاری ہے۔

مختلف جنسی شناخت ایب نارمیلٹی کیوں؟

ایک اور سوال بھی اٹھایا جانا ضروری ہے کہ ہم جو خود کو نارمل سمجھتے ہیں، آخر کن بنیادوں پر اپنے سے مختلف سیکسوئیلٹی کے حامل افراد کو ایب نارمل کہتے ہیں؟ صرف اس بنیاد پر کہ ان کی جنسی جبلت ہم سے

ذرا مختلف انداز میں تسکین پاتی ہے۔ اگر آپ کو عورت کشش کرتی ہے تو اس میں آپ کا کیا کمال ہے؟ اور اگر ایک گے (Gay) کو عورت کشش نہیں کرتی تو اس میں اس کا کیا قصور؟ اگر یہ قصور ہے تو پھر اس کی ذمہ داری سیدھی سیدھی قدرت پر عائد ہوتی ہے کہ اس نے ہوموسیکسوئل کی سرشت میں میڑھ رکھ دی۔ یہی الزام کہیں زیادہ یقین کے ساتھ خواجہ سراؤں کے حوالے سے عائد کیا جا سکتا ہے کہ قدرت ان کے جنسی اعضا مکمل کرنے میں ناکام رہی۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ الزام تراشی سے حل نہیں کیا جا سکتا، ہاں البتہ اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں کہ ہمارے درمیان بہت سے ایسے افراد موجود ہیں جن کی جنسی شناخت روٹین سے ہٹی ہوئی ہے۔ تو کیا اس سے اس بات کا جواز حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ان افراد کو اجتماعی جبر کے ساتھ مجرموں کی طرح چھپنے پر مجبور کر دیا جائے۔ آخر ہم کس دلیل کے ساتھ ان سے نفرت اور تضحیک کا رویہ رکھ سکتے ہیں۔ کیا ان میں اور آپ میں جنسی شناخت کے علاوہ کوئی اور فرق بھی ہے؟ کیا وہ تخلیقی ذہن کے مالک نہیں؟ کیا وہ روٹین کے کام سرانجام دینے سے معذور ہیں۔ کیا وہ عبادت گزار نہیں ہیں؟ اگر ان میں کچھ لوگ اچھے کردار کے حامل نہیں تو نام نہاد نارمل جنسیت کے حامل افراد میں بدکردار افراد کی تعداد ان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ آخر وہ آپ سے جنسیت کے علاوہ اور کس معاملے میں مختلف یا عجیب ہیں۔ اگر ہم مرد اور عورت کی جنسی شناخت کو بلا اکراہ تسلیم کرتے ہیں تو ان کی شناخت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ سوچنے کی بات تو یہ بھی ہے کہ اس فطری اختلافی صورت کو تسلیم کرنے کی وجوہات اپنی اصل میں فطری ہیں یا سماجی؟

کیا آپ کوئی ایسی ڈش خوشی سے اور پیٹ بھر کے کھا سکتے ہیں جسے دیکھتے ہی نہ صرف آپ کی بھوک مر جائے بلکہ اُلٹا متلی ہونے لگے؟ جبکہ پاس ہی آپ کی کوئی پسندیدہ ڈش بھی موجود ہو۔ اور اگر کوئی آپ کو ہٹھاً ایسا کرنے پر مجبور کرے تو آپ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے؟ کیا آپ اس سے اس کی دھونس کی دلیل طلب نہیں کریں گے؟ کیا آپ اس سے یہ نہیں کہیں گے کہ وہ آپ کو وہ ڈش کھانے پر کیوں مجبور کر رہا ہے جسے ہضم کرنا تو دور کی بات آپ زبان پر بھی نہیں رکھ سکتے۔ اگر آپ حکم دینے والے سے خوف زدہ ہیں اور مزید یہ کہ اس کی پشت پر اکثریت کی دھونس بھی کھڑی ہے تو پھر ایک ہی

صورت ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ آپ بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان دے رہے ہیں۔

غور کیجئے کیا ہم نام نہاد نارملٹی کے دعوے دار اپنے سے مختلف سیکسولٹی رکھنے والے انسانوں کے ساتھ ایسا ہی نہیں کر رہے۔ مجھے ایک گے (Gay) نے بتایا کہ عورتیں اسے ایک پرسنٹ بھی کشش نہیں کرتیں۔ ان کا جسم اسے بالکل بے جان ربڑ جیسا لگتا ہے جسے چھو کر اس کی جنسی حس ذرا سا بھی ارتعاش محسوس نہیں کرتی۔ جبکہ ان کے آرگیزم کے وقت ایسی گھن انگیز بو آتی ہے کہ کچھ دیر کے لیے یا تو وہ سانس روک کر پڑا رہتا ہے اور پھر فراغت پاتے ہی باتھ روم کی جانب بھاگنا پڑتا ہے۔ یہ ایک شادی شدہ شخص کی کہانی ہے جسے اس کے گھر والوں نے زبردستی شادی کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ بیوی کے ساتھ سیکس کرنا کسی عذاب جیسا تھا جو زبردستی اس پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ وہ تو شکر ہوا کہ سات برس بعد طلاق ہوگئی تو ان صاحب کی اپنی فطرت کے خلاف اس رشتے سے جان چھوٹی۔ یہی معاملہ لیزبین عورتوں کا ہے کہ جنہیں دوسری عورتوں کے برعکس مردوں میں بالکل کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کے دل کا انتخاب ان کی ہم جنس ہی ہوتی ہیں۔

پیٹ کی بھوک ہو یا سیکس کی۔ یہ ہر حال میں اپنی تسکین چاہتی ہے۔ ہمیں نہ تو یہ حق حاصل ہے اور نہ ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل کہ ہم کسی کی جبلت کی تسکین کے خلاف کوئی حکم صادر کر سکیں۔ ہاں البتہ اس تسکین کے لیے اختیار کیے گئے راستوں پر ضرور بحث ہو سکتی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک سوال اٹھاتے چلیں اور وہ یہ کہ آخر مرد اور عورت آپس میں تعلق کیوں بناتے ہیں؟ کیا صرف اولاد کے لیے؟ یا اس کا محرک کوئی اور جذبہ ہے، جیسے کہ جنسی کشش۔ کیا آدم اور حوا نے پہلا جنسی تعلق اپنی نسل آگے بڑھانے کے لیے بنایا تھا یا اس کا محرک ان میں ظاہر ہو جانے والا جنسی جذبہ تھا؟ میرے خیال میں اگر معاملہ جنسی نہ ہوتا تو کھایا ہوا سیب یا گندم کا دانہ کبھی آدم اور حوا کے اولین تعلق کی علامت کا روپ نہ دھارتے۔ جدید سائنس نے تو ویسے ہی سیکس ریلیشن اور اولاد کی پیدائش کے دائروں کو بالکل الگ کر دیا ہے۔ سو اب سیکس نسل بڑھانے سے کہیں زیادہ صرف لطف لینے کا معاملہ ہے۔ یہ لطف ایک خاص وقت میں دو افراد کا سراسر ایک نجی معاملہ ہے جس میں کسی تیسرے کو مداخلت یا فتوے بازی کا حق

نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں البتہ کسی فرد کا کسی دوسرے کو زبردستی اپنے لطف کے لیے استعمال کرنا (چاہے وہ اس کی منکوحہ ہی کیوں نہ ہو) ایک سنگین سماجی جرم ہے۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کتنے ایسے شوہر ہوں گے جو اپنی بیویوں سے ان کی مرضی کے خلاف نہ صرف سیکس کرتے ہوں گے بلکہ اس دوران ایسے طریقے اختیار کرتے ہوں گے جو ان کی بیویوں کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تکلیف دہ ہوتے ہوں گے، مگر وہ عورتیں سماجی دباؤ کی وجہ سے خاموش رہنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اگر آپ نے پورن فلمیں دیکھ رکھی ہیں تو پھر مجھے اپنی بات سمجھانے کے لیے تفصیل میں جانے کی زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔ تو کیا ہم نے کبھی سوسائٹی کے اس ناجائز اور قابل نفرت رویے کو ختم یا کم کرنے کے بارے میں سوچا جس نے ممکن ہے خود ہماری اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی زندگی اجیرن بنا رکھی ہو۔ بلکہ عملی صورت حال یہ ہے کہ اگر کوئی عورت آواز اٹھاتی بھی ہے تو سوسائٹی کی ساری مردانگی اس کے مقابل آ کھڑی ہوتی ہے۔

یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ نارمل سیکسوئیلٹی کے ٹھیکیداروں کے ہاں ان سے مختلف جنسیت کے حامل افراد کے لیے نفرت کی حد تک ناپسندیدگی پائی جاتی ہے، اور یہ معاملہ ہماری سوسائٹی میں کچھ زیادہ ہی شدید ہے۔ مگر ان شریف لوگوں نے جو اکثریت کی جابرانہ دھونس سے ڈرے ہوئے لوگ ہیں۔ سماج کی اجتماعی پرچلت سوچ اور اخلاقی معیار اکثر اپنے ہی اراکین کے لیے مصیبت بن جاتے ہیں کیونکہ وہ ان کی حقیقی ضروریات کی مخالف سمت میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اکثریت سے ہٹ کر مختلف سیکسوئیلٹی کے حامل افراد کے لیے تو یہ صورتحال بہت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

عوام ہی نہیں خواص کی سطح پر بھی فرد کی جنسی شناخت کا معاملہ سخت غلط فہمی کا شکار ہے۔ ہم نے روٹین سے ہٹی ہوئی جنسی شناخت کو خوامخواہ گناہ سے جوڑ دیا ہے جبکہ اس کے لیے ہمارے پاس کوئی علمی اور عقلی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ مذہبی افراد بنا کسی سنجیدہ تحقیق کے اس موقف پر کھڑے ہیں کہ ہم جنسیت سماجی کج روی کا معاملہ ہے اور اس کی ابتدا حضرت لوط کی قوم سے ہوئی تھی جبکہ سائنسی ریسرچ

یہ حقائق ہے نہ صرف انسانوں میں یہ خلقی معاملہ ہے بلکہ جانوروں کی 1500 کے قریب انواع ایسی ہیں جن میں ہم جنسیت کا واضح میلان پایا جاتا ہے جن میں پینگوئن، چمپینزی اور ڈالفن شامل ہیں۔ گویا یہ معاملہ کسی سماجی کج روی کا نہیں بلکہ جانوروں اور انسانوں کی فطرت کا ناگزیر حصہ ہے۔ سگمنڈ فرائڈ جسے جدید نفسیات کا بابا آدم مانا جاتا ہے، اس کے مطابق ہر فرد دونوں طرح کے جنسی رجحان لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر اسے آزادانہ انتخاب کا موقع فراہم کیا جائے تو پھر وہ خود سے طے کر سکتا ہے کہ اسے کس صنف کے ساتھ تعلق بنانا زیادہ تسکین دہ لگتا ہے۔ لیکن سماجی دباؤ اکثر ہم جنس پسندوں کو اپنی سیکشوئیلٹی کے اظہار کی اجازت نہیں دیتا۔ مذہبی ذہن کے متاثل فرائڈ کی بات اس لیے زیادہ وزنی ہے کہ وہ اس کے برعکس ریسرچ کی بنیاد پر بات کرتا ہے جسے محض مذہبی اساطیر کے ذریعے غلط ثابت کرنا ممکن نہیں۔

1973 ء سے پہلے تک ہم جنسیت کو ایک بیماری تصور کیا جاتا تھا اور خیال تھا کہ علاج کے ذریعے فرد کو 'نارمل' جنسی رویے کی جانب لایا جا سکتا ہے مگر جب علاج سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی تو اس رجحان کو بیماریوں کی فہرست سے نکال کر فطری تسلیم کر لیا گیا۔ بہت سے سائنسدان اس رائے کے حامل ہیں کہ ہم جنسی رویہ خلقی اور پیدائشی ہے نہ کہ سماجی۔

بہت سے افراد ایسے ہیں جو اگرچہ مخلوط جنسی ہیں مگر ان میں عورت بن کر جینے کی خواہش حاوی ہوتی ہے۔ وہ اپنی غیر واضح مخلوط جنسی شناخت کے ساتھ بے چینی کا شکار رہتے ہیں۔ انہیں یوں لگتا ہے جیسے ان کے مردانہ بدن میں کوئی عورت قید ہو جس کی آزادی کے بعد ہی وہ نارمل زندگی جی پائیں گے۔ یہ یقیناً ایک اذیت ناک زندگی ہے جو انہیں قدرت کی غلطی کے نتیجے میں ملتی ہے۔ اگرچہ جدید سائنس نے ان کے لیے تبدیلی جنس کے آپریشن کے ذریعے واضح جنسی شناخت کا انتخاب ممکن بنا دیا ہے مگر اس عمل کو سماجی قبولیت پانے میں شدید دشواری کا سامنا ہے۔ ایک چوبیس سالہ ایرانی نوجوان علی عسکر جو آپریشن کے بعد نگار کے نام سے لڑکی بن کر اپنی فطری شناخت حاصل کر چکا ہے، اپنے باپ کے رویے سے شدید پریشان ہے۔ نگار کے باپ نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے آپریشن کروایا تو وہ اسے قتل

کر دے گا۔ نگار کے حصول وہ اسے جانے میں جو بے مار گولیاں ملا کر مارنے کی کوشش کر چکا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر آپریشن ناگزیر نہ ہوتا تو وہ خدا کے کام میں دخل کیوں دیتی۔ مگر وہ کیا کرے کہ علی اصغر کے نام سے اس کی کوئی شناخت نہیں تھی۔ وہ مردوں میں کام نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ اسے ہراساں کرتے تھے، اور عورتوں کے ساتھ کام کرنے میں یہ رکاوٹ تھی کہ وہ قانونی طور پر عورت نہیں تھی۔

پوری اسلامی دنیا میں ایران واحد ملک ہے جہاں آیت اللہ خمینی کے فتوے کے ذریعے ایسے آپریشن کی قانونی اجازت دی گئی ہے۔ دنیا میں تھائی لینڈ کے بعد ایران ایسا ملک ہے جہاں تبدیلی جنس کے سب سے زیادہ آپریشن ہوتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مخلوط النسل افراد کے جنسی تبدیلی کے آپریشن کے نصف اخراجات ایرانی حکومت ادا کرتی ہے۔ مگر اس معاملے کا ایک دردناک پہلو بھی ہے کہ ایران میں ہم جنس پسند ہونے کی سزا موت ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر فرد اپنی جنس بدلنے کا خواہاں ہو لیکن المیہ یہ ہے کہ اپنی سیکسوئلٹی کے اظہار کی قیمت انہیں سزائے موت کی صورت میں ادا کرنا ہوگی۔ ایسے بہت سے افراد ہیں جنہیں اس سماجی اور حکومتی جبر سے نجات کے لیے وطن سے فرار ہونا پڑا۔

پاکستان میں ایسے افراد کے لیے تبدیلی جنس کا کوئی قانون موجود ہی نہیں جو اپنے ظاہری مردانہ جسم میں عورت بننے کی خواہش لیے پھرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے پاس اپنی اس عین فطری خواہش کو پورا کرنے کا صرف ایک ہی راستہ بچتا ہے کہ وہ اپنا مردانہ عضو قطع کروا کے خواجہ سراؤں کی کسی ٹولی میں شامل ہو جائیں۔ ایسے فرد کو نربان کہا جاتا ہے اور خواجہ سرا اسے بہت عزت دیتے ہیں۔ نربان بننے کا عمل بڑے دل گردے کا تقاضہ کرتا ہے۔ یہ ایک خطرناک جراحی ہے جو کسی سرجن کی مدد کے بغیر سرانجام دی جاتی ہے۔ اس میں متعلقہ فرد کی جان بھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ خواہش کتنی منہ زور ہوگی جس کے لئے کوئی فرد ایک ایسے عضو کی قربانی پر بخوشی راضی ہو جاتا ہے جس کے لیے کوئی مرد کروڑوں کے عوض بھی حامی نہ بھرے۔

یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر نفرت بھری ہوئی نگاہ ڈال کر منہ پھیر لیا جائے۔ یہ کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اس کے اندر قید عورت کے راستے میں اس کا مردانہ بدن کسی ولن کی طرح کھڑا ہے جس کی اسے

کوئی خواہش نہیں ہے کہ وہ اس کی حقیقی جنسی شناخت کا دشمن ہے۔ یہ جسم جیل کی کال کوٹھڑی جیسا ہے جس میں بند ایک عورت کا دم گھٹ رہا ہے۔ سماج اس عورت کو باہر آنے کی اجازت دینے پر راضی نہیں کیونکہ وہ خود گناہ اور ثواب کے تصور کا قیدی ہے۔ اگر چہ اس کے پاس اپنے ان تصورات کی کوئی مدلل توضیح بھی نہیں ہے۔ سماج کے پاس ایسے مظلوم انسان پر سوائے استہزاء کرنے اور اس کے فطری لطف پر پابندی کا حکم جاری کرنے کے نہ تو کوئی علاج ہے اور نہ ہی کوئی جواب۔ سماج ایسے فرد کی اذیت محسوس کرنے سے یکسر عاری ہے۔ ایک ایسا فرد جو اپنی حقیقی جنسی شناخت کی بازیافت چاہتا ہے، سوسائٹی بے دلیل دھونس کے ساتھ اس پر اپنا جبر نافذ کر دیتی ہے۔

میں ایسی کئی لڑکیوں کے بارے میں اخبارات پڑھ چکا ہوں اور چند ایک کو ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں جو اپنی محبوبہ کی مستقل رفاقت کی خاطر جنس کی تبدیلی کا آپریشن کروانے کو تیار ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی تو خود ڈاکٹر ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ ایک لڑکی کے اپنی حقیقی شناخت کو پانے کی تڑپ کا معاملہ ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس تبدیلی کے بغیر اس کی روح قرار نہیں پا سکے گی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کیا سماج کے نارملیٹی کے دعوے داروں کو کسی دوسرے کی جنسیت کو طے کرنے کا حق دیا جا سکتا ہے؟ آخر سماج کے پاس اس تحکم کے لیے کیا دلیل ہے؟؟

ممکن ہیں وہ یہ کہیں کہ یہ جنسی بے راہروی کا معاملہ ہے۔ مگر یہ ایک بہت بیہودی بات ہے۔ جنسی بے راہروی کی اگر تعریف متعین کی جائے تو وہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ کسی بھی فرد کی کسی دوسرے کی جنسی زندگی میں مداخلت ہی اصل میں جنسی بے راہروی ہے نہ کہ دو آزاد افراد کا باہمی مرضی سے تعلق۔

جہاں تک حقیقی معنوں میں جنسی بے راہروی کا تعلق ہے، اس سے تو ہمارا سماج تھڑا پڑا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا جب معصوم بچوں، لڑکیوں اور شادی شدہ عورتوں کے ساتھ زیادتی کی خبریں میڈیا میں نہ آتی ہوں۔ ابھی حال ہی میں قصور کے ایک سرحدی گاؤں میں سامنے آنے والا سکینڈل اس کی بدترین مثال ہے۔ اس سے پہلے جاوید نامی ایک جنونی کا معاملہ بھی سامنے آیا تھا جس نے سو کے قریب بچوں

کے ساتھ زیادتی کے بعد انہیں قتل کر کے ان کے اجسام کو تیزاب میں گلا ڈالنے کے بھیانک جرم کا اعتراف کیا تھا۔

یہ تو خیر سیدھے سیدھے غیر قانونی اور غیر اخلاقی معاملات کی بات ہے مگر ہمارے ہاں تو اخلاق مذہب اور قانون کے نام پر بھی جنسی جرائم عام ہیں لیکن انہیں جرم نہیں سمجھا جاتا بلکہ انکا شادیانے بجائے جاتے ہیں۔ میرا اشارہ ان شادیوں کی طرف ہے جن میں دولہا دولہن کی بالکل مرضی شامل نہیں ہوتی۔ کئی معاملات میں تو دونوں ہی کہیں اور شادی کے خواہشمند ہوتے ہیں مگر انہیں شادی کے مقدس بندھن کے نام پر جبراً ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ کئی شادیاں تو اتنی اَن میل بے جوڑ ہوتی ہیں کہ کم عمر بچیوں کو باپ سے بڑی عمر کے شخص سے بیاہ دیا جاتا ہے۔ عمومی طور یہ وہ عمر ہوتی ہے جب بچیوں کو معلوم تک نہیں ہوتا کہ شادی کس چڑیا کا نام ہے۔ وہ بے چاریاں تو بس نئے کپڑوں کے چاؤ میں ماری جاتی ہیں۔ اگر ہم ریپ کی تعریف کے تعین کی بات کریں تو یہ ایسا عمل ہے جس میں کوئی فرد اپنی مخالف جنس کے فرد کے ساتھ زبردستی جنسی تعلق بنائے۔ اس تعریف کے مطابق دیکھیں تو ہمارے ہاں ہونے والی ناپسند کی شادیاں ریپ کے زمرے میں ہی آتی ہیں۔

خواجہ سرا

ہمارے سماج کی ایک بدنصیب کمیونٹی جن کے لیے ہم تام نہاد نارمل اور مہذب لوگوں کے پاس ایک استہزا اور بھیک کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم انہیں ایک ایسی خامی کی سزا دیتے پھرتے ہیں جن میں ان بے چاروں کا ایک فیصد بھی قصور نہیں۔ اور سزا بھی یہ کہ ہم انہیں انسان کے طور پر قبول کرنے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ ہم نے ان کی جنسیت کو زبردستی ان کے کردار کے ساتھ نتھی کر دیا ہے اور کردار بھی ایسا کہ جس پر اٹھتے بیٹھتے تھو تھو کر کے ہم اپنے کردار کا بھرم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ اس کمیونٹی کے حوالے سے بدچلنی اور بے راہ روی کے ہزاروں الزام دہرائیں مگر سچ تو ہے کہ ان کے ساتھ ہمارا رویہ مجرمانہ حد تک غیر انسانی ہے بلکہ یہ رویہ ہمیں اخلاقی حوالے سے بے حد کمزور، گھٹیا اور معذور ثابت کرتا ہے۔ ہمیں کیونکر یہ حق حاصل ہے کہ ہم انہیں محض جنسیت کی بنیاد پر ایک کریہہ بلکہ مضحکہ خیز زندگی جینے پہ

مجبور کریں۔ اگر ہم خواجہ سراؤں پر بے راہ روی کا الزام دھرتے ہیں تو یہ کیوں نہیں سوچتے کہ انہیں اس راہ پر دھکیلنے میں ہمارا کتنا ہاتھ ہے۔ وہ کون ہیں جو خوبصورت مخنثوں پر عاشق ہوتے ہیں، ان کے ساتھ تعلق بنانے کے لیے مرے جاتے ہیں۔ کئی تو ان کے ساتھ شادی تک کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ کون ہیں جو گاڑیوں میں ان مقامات کا طواف کرتے ہیں جہاں یہ مخنث رات ڈھلے اپنی 'روزی' کمانے کی آس میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اور وہ کون معززین ہوتے ہیں جو انہیں گاڑیوں میں اٹھا کر یا قریبی جھاڑیوں میں لے جا کر چند روپوں کے عوض کھٹیا ذہنیت کا گھناؤنا کھیل کھیلتے ہیں۔ اور پھر دن کی روشنی میں اپنے جیسے دوسرے 'معززین' کے ساتھ مل کر ان کے کردار پر طعن کرتے ہیں۔ ان پر بدکرداری کی تہمت دھر کر خود کو باکردار ثابت کرتے ہیں۔

سچ پوچھئے تو یہ خواجہ سرا اپنی ذات میں ہماری منافق اور بدکردار سوسائٹی کے عکس کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ ہم ہیں جنہوں نے انہیں یہ کردار ادا کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ یہ کوئی جرم نہیں کہ انہیں عورتوں کی طرح بننا سنورنا اور رقص کرنا اچھا لگتا ہے۔ مگر بننے سنورنے اور رقص کو ہم کس بنیاد پر غیر اخلاقی حرکت گردان سکتے ہیں۔ یہ تو سراسر کسی فرد کا وہ ذاتی فعل ہے جو کسی دوسرے کا کوئی نقصان نہیں کرتا۔ اگر ان کا لباس دیکھ کر کسی کے اندر کا وحشی جانور بھڑک اٹھتا ہے تو وہ اپنا علاج کروائے نہ کہ خواجہ سراؤں کے انداز زیست کو بدلنے کا مطالبہ کرے اور انہیں اپنے جیسا 'نارمل' بننے پر مجبور کرے۔ اگر آپ کو ان کا کردار بدلنے کی اتنی ہی خواہش ہے تو انہیں ایک انسان کے طور پر قبول کیجئے۔ ان کے لیے تعلیم، تربیت اور روزگار کے وہ تمام دروازے کھول دیجئے جو آپ نے اپنے اور اپنی اولاد کے لیے روا رکھے ہیں۔

جنسی بے راہروی میں سماجی جبر کا حصہ

سچ تو یہ ہے کہ یہ جسے ہم جنسی بے راہ روی کہتے ہیں یہ سراسر نام نہاد نیک اور پارسا سماج کا پیدا کیا ہوا مسئلہ ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ اس بے راہ روی سے جنسی بھوک مٹانے والے مرد بھی اس کے خلاف بلند آواز میں نعرہ زن ہیں۔ سماج کی طرف سے ہونے والا دہرا ظلم یہ ہے کہ پہلے تو مختلف جنسی شناخت

کے افراد کو اچھوت بنا دیا جاتا ہے اور پھر چھپ چھپا کر انہی سے جنسی لذت بھی کشید کی جاتی ہے۔ سماج صدیوں سے اس بات پر اڑا کھڑا ہے کہ انہیں نارمل انسان کے طور پر قبول نہیں کرنا بھلے وہ عام لوگوں کے مقابلے میں کتنے ہی زیادہ باکردار اور پروڈکٹو کیوں نہ ہوں۔

خواجہ سراؤں کی صورتحال بڑی تکلیف دہ ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یہ لوگ گھر کے کسی بچے کی پیدائش اور شادی بیاہ کے مواقع پر ناچ گا کر روزی کما لیتے تھے مگر شادی ہالوں اور میوزک ہو حتیٰ کے رواج نے ان کو تقریباً بے روزگار کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ ہم نے کام کے تقریباً سبھی شعبوں میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ چونکہ سوسائٹی انہیں ایک نارمل انسان کے طور پر قبول کرنے سے انکاری ہے سو ان کے لیے دن کے وقت بھیک مانگنے اور راتوں کو سیکس ورکر کے طور کام کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچا۔

غور کریں تو اصل مسئلہ ان افراد کا نہیں جو پیدائشی طور پر ہم جنس پسند یا خواجہ سرا ہیں بلکہ اصل مسئلہ تو ان لوگوں کا ہے جو عورت دستیاب نہ ہونے کی صورت میں معصوم بچوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں اور کئی کیسز میں ان کو بے دردی سے قتل بھی کر دیتے ہیں۔ یہ ہولناک جرم ہمارے ہاں تیزی سے پھیل رہا ہے مگر سوسائٹی اس کے بارے میں ذمہ دارانہ حساسیت سے عاری دکھائی دیتی ہے۔ ہاں البتہ خوفناک سزا دلوانے کے معاملے میں بہت اتاؤلی دکھائی دیتی ہے۔

انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کے مطابق پاکستان میں ایک کروڑ پچیس لاکھ بچے مزدوری کرنے پر مجبور ہیں اور یہی وہ بچے ہیں جو جسمانی اور جنسی تشدد کا آسان ترین شکار بنتے ہیں۔ اکثر ٹرک ڈرائیور گھروں سے کئی کئی روز دور رہنے کی وجہ سے اس علت کے عادی ہوتے ہیں۔ اول تو وہ کوئی نوعمر لڑکا سفر میں اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور اگر یہ 'سہولت' بوجوہ دستیاب نہ ہو تو وہ راستے میں پڑنے والے ہوٹلوں پر ملازمت کرنے والے بچوں کے ساتھ زبردستی بدفعلی کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ہوٹلوں اور ورکشاپوں پر کام کرنے والے بچے اکثر اپنے مالکان کی ہوس کا آسان ہدف ہوتے ہیں۔ اسی طرح کچرا اکٹھا کر کے بیچنے والے لڑکوں پر بھی اکثر اوباشوں کی نظر ہوتی ہے اور انہیں جب بھی موقع ملے ان کے ساتھ زیادتی کر گزرتے ہیں۔

مذہبی مدارس اور علت المشائخ

ہمارے ہاں مذہبی مدرسوں میں یہ علت عام ہے۔ خاص طور پر ایسے مدارس جہاں دور دراز علاقوں کے غریب والدین اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم اور حفظِ قرآن کے لیے داخل کروانے کے بعد مہینوں ان کی خبر نہیں لیتے۔ زیادتی کا شکار ہونے والے یہی بچے جب تعلیم کی تکمیل کے بعد کسی مسجد میں امام بنتے ہیں تو یہ خود بھی کوئی کمی نہیں اٹھا رکھتے۔ یہ حضرات جب گھروں میں بچوں کو قرآن پڑھانے جاتے ہیں تو وہاں بھی ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جن بچوں کے ساتھ یہ واردات ہوتی ہے ان میں سے اکثر بچے خوف کی وجہ سے والدین کو نہیں بتا پاتے کہ مولوی صاحب مقدس تعلیم کے پردے میں کتنا گھناؤنا کھیل کھیل رہے ہیں۔ جو بچے بتانے کی جرأت کرتے بھی ہیں اُلٹا انہیں والدین کی جانب سے مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہت کم والدین ہیں جو اپنے بچوں کے حق پر یقین کرتے ہیں، ورنہ اکثریت یہی سمجھتی ہے کہ بچہ تعلیم سے جان چھڑانے کا بہانہ کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں یہ بڑا مقبول خیال ہے اور ہم اسے بڑے فخر سے بیان بھی کرتے ہیں کہ اخلاقیات اور نیکی بدی کا تصور مذہب کی دین ہیں مگر افسوس کہ ہمارے معصوم بچے مذہب کے مبلغوں کے ہاتھوں ہی سب سے زیادہ خطرے کا شکار ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی مذہبی مدرسے سے تحصیل یافتہ طالب کے انٹرویو کر کے دیکھ لیجئے۔ آپکو تصدیق کے لیے کئی کہانیاں مل جائیں گی۔ ورنہ اخبارات اور ٹی وی چینل تو آپکی پہنچ میں ہیں جو آئے دن ایسے گھناؤنے واقعات بیان کرتے رہتے ہیں۔

ہماری قابلِ احترام مگر ہم جنس پسند شخصیات

ہم نام نہاد نارمل جنس کے دعویداروں کو جب کسی کے روٹین سے ہٹے ہوئے جنسی رجحان کا علم ہوتا ہے تو ہم بنا سوچے سمجھے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کے احباب یا گھر کے افراد میں ایسے لوگ موجود ہوں جنہوں نے آپ کی نفرت کے خوف سے کبھی اس رجحان کو ظاہر نہ کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود آپ بھی اس رجحان کے حامل ہوں مگر سوسائٹی کی نفرت کا خوف آپ کو یہ حقیقت راز بنائے

سمجھنے پر مجبور کرتی ہو۔ مگر عجیب بات ہے کہ سوسائٹی اس حوالے سے بھی معروف ہستیوں اور خاص طور پر مذہبی حکمرانوں، صوفیوں، مولاناؤں، شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کو نہ صرف معتوب نہیں کرتی بلکہ اُلٹا انہیں سر پہ بٹھاتی ہے۔ ایک نام نامی تو محمود غزنوی کا ہے جن کا اپنے غلام ایاز سے عشق بلا خیز مشہور ہے۔ اقبال کا یہ مصرعہ "نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں" اس عشق کی جانب ایک بلیغ اشارہ ہے۔ محمود غزنوی کے اس رجحان کے بارے میں تاریخ میں بھی کئی واقعات محفوظ ہیں۔ سلطان کے بارے میں خوند میر رقم طراز ہے۔

"سلطان محمود غزنوی کو مشتری چہرہ غلاموں سے عشق تھا۔ فضل بن احمد بھی اس شوق میں اپنے آقا کا مقلد تھا۔ مثل مشہور ہے کہ غلام اپنے آقا کی پیروی کرتا ہے۔ اسے کسی نے بتایا کہ ترکستان میں ایک نہایت حسین غلام ہے۔ اس زہرہ جبیں کو حاصل کرنے کے لیے فضل بن احمد نے اپنا ایک کارندہ وہاں بھیجا اور اسے تاکید کی کہ وہ غلام کو عورتوں کی طرح محمل میں چھپا کر لائے۔ ایک مخبر نے سلطان کو یہ بات بتا دی۔ سلطان نے وزیر سے کہا کہ وہ اس سیم اندام کو حضور میں پیش کرے۔ وزیر لیت و لعل کرتا رہا۔ اگرچہ اسے یقین تھا کہ سلطان اس کی جان و مال پر قدرت رکھتا ہے۔ سلطان نے اپنے وزیر سے کہا کہ آج ہم تمہارے گھر آئیں گے۔ وزیر نے اسے اپنی عزت افزائی سمجھ کر سلطان کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ جب وہ غلام حور شمائل سلطان کے حضور میں آیا تو سلطان نے خشمگیں ہو کر وزیر کو سخت سست کہا اور اسی وقت حکم دیا کہ وزیر کا مال و متاع ضبط کر لیا جائے۔ اس کے چند روز بعد سلطان عازم ہند ہوا اور اس کی غیر حاضری میں دشمنوں نے اسے شکنجے میں کس کر عذاب دے دے کر مار ڈالا۔"

(دستور الوزراء)

ہماری تاریخ کا ایک معروف نام خلیفہ ہارون الرشید کا ہے جو شکم پرستی پر فریفتہ تھا۔ اس کا بڑا بیٹا امین بھی دن رات نوخیز لڑکوں کی صحبت میں وقت گزارتا تھا۔ اس کے سب سے چہیتے محبوب کا نام کوثر تھا۔

سعدی شیرازی جن کی حکایات ہمارے سکولوں کے سلیبس کا حصہ ہیں ہم جنسیت پسند تھے۔ اس حوالے سے ان کی معروف تصنیف "گلستان" کا پانچواں باب قابل ذکر ہے۔ ان کی عادت تھی کہ خوبصورت لونڈوں کی جھلک دیکھنے کے لیے میلوں پیدل سفر کرتے تھے۔ ان کا یہ زبان زد خاص و عام شعر ان کے رجحان کی وضاحت کے لیے کافی ہے:

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

پنجابی صوفی شاعر شاہ حسین بھی ایک نوخیز ہندو لڑکے کے ساتھ اپنے افلاطونی عشق کی نسبت سے مادھو لال حسین کے نام سے معروف ہوئے اور ساری زندگی اس کے نام لگا دی۔ میر تقی میر بھی کسی حد تک اس رجحان کے حامل تھے۔ وہ اپنے دواوین میں دلی کے لونڈوں سے انتہائی بازاری زبان میں اظہار عشق فرماتے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے:

خط نمودار ہوا وصل کی راتیں آئیں
جن کا اندیشہ تھا منہ پر وہی باتیں آئیں

جوش صاحب نے تو عشق کی ابتدا ہی ایک لڑکے سے کی اور اپنی خودنوشت 'یادوں کی برات' میں اس کا دھڑلے سے ذکر کیا۔ احمد بشیر نے اپنے ایک مضمون میں بطرس کے بڑے بھائی زیڈ اے بخاری کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ بھی یہ شوق فرماتے تھے۔

ان معروف شخصیات کے ہم جنسیت کی طرف میلان کا تذکرہ کرنے کا مطلب انہیں بدنام کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ سماج کے دوغلے رویے کو آشکار کرنا مقصود ہے۔ نفسیات دان تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جنسی حوالے سے منفرد لوگ اور ہم جنسیت پسند عمومی طور پر تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔ یہاں میں نے قصداً دوسری اقوام کے مشاہیر کا تذکرہ نہیں کیا۔ اسے میرے تعصب پر محمول نہ کیا جائے تو مناسب ہوگا۔ وجہ اس کی صرف اتنی ہے کہ مجھے اس معاملے میں صرف اپنے سماج کے لوگوں سے غرض ہے جو ان معاملات سے نہ صرف آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں بلکہ اس کے برعکس اپنے اخلاقی

معیاروں کا استدراک پیچھے سے بھی باز نہیں آتے۔ اس صورت میں لازم ہے کہ ہم دوسروں کی جانب انگشت اٹھانے کی بجائے حقیقت کے غیر جانبدار اور شفاف آئینے میں اپنی صورت دیکھیں کہ اس پہ کہاں کہاں اور کیسے داغ موجود ہیں۔

ہمارے سماجی پس منظر میں
ایک ایسے موضوع پہ
بات کرتی ہوئی کتاب
جو ہر بالغ فرد کا مسئلہ ہے مگر
ہم نے اس موضوع کو فحش مان کر
سنجیدہ گفتگو کو
تقریباً ناممکن بنا دیا ہے

نروان پبلیکیشن ہاؤس
2-۲۲۹ ڈی-۱ ٹاؤن شپ لاہور۔ پاکستان
موبائل: 0321-4272847